بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

کیا عدالتی فیصلہ ایک انقلاب کا نقیب بنے گا؟

خرم مراد

۲۰ مارچ کو صبح ساڑھے دس بجے کراچی میں ' سپریم کورٹ کے ۵ رکنی فل بنچ نے ججوں کے تقرر کے بارے میں جو فیصلہ سنایا' وہ یقیناً عدلیہ کی آزادی کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس فیصلے پر کماحقہ عمل ہوا۔ جو حکومت کی طرف سے عدلیہ کے خلاف جنگ چھیڑ دینے کی وجہ سے مشکوک لگ رہا ہے۔ تو کسی حکمران کے لیے مطلق العنان بننا انتہائی دشوار ہو جائے گا۔ یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ ججوں کو اپنی مرضی کا تابع بنانے کے لیے غیر آئینی اقدامات کرے جو موجودہ حکومت دھڑلے سے کر رہی تھی۔ عدالت نے حکومت کو پابند کر دیا ہے کہ چیف جسٹس پاکستان کے مشورے سے جج مقرر کرے 'اپنے من مانے تقرر نہ کرے۔ قائم مقامی اور عارضیت کی تلوار ججوں کے سر سے اٹھائے 'اور تین ہائی کورٹوں میں دو سال سے جو قائم مقام چیف جسٹس مقرر کیے ہوئے ہیں ان کی جگہ مستقل چیف جسٹس مقرر کرے۔ ججوں کو شریعت کورٹ میں بھیج کر ان سے چھٹکارا حاصل کرنے اور ان کے منصب اور مقام کو غیر محفوظ اور فروتر کرنے کو بھی اس نے خلاف آئین قرار دے دیا ہے۔

لیکن اس فیصلے کے مضمرات صرف ججوں کے تقرر اور عدلیہ کی آزادی تک محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور دور رس ہیں 'اتنے وسیع اور دور رس کہ وہ پوری قومی زندگی پر اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ فیصلہ پوری قوم کے لیے ایک سنگ میل ہے 'یا کم سے کم بن سکتا ہے۔ جن مسلمہ مقدمات اور آئینی دفعات کی صاف اور واضح تشریحات پر یہ فیصلہ قائم ہے 'اور جو اس کے منطقی اور قانونی نتائج ہیں 'اگر پاکستان کی عدالتیں پوری جرات اور استقلال کے ساتھ ان کی پاسبانی کرتی رہیں 'اور ان کو ایک تسلسل کے ساتھ وسعت دیتی اور آگے بڑھاتی رہیں 'تو وہ یقیناً اس یاس زدہ ملک کے اندھیروں میں امید کی شمع جلانے کا باعث بنیں گی 'اور کیا عجب کہ وہ ایک ایسے آئینی انقلاب کی نقیب بھی بن جائیں جس کے نتیجے میں ملک کو قیام عدل کی نعمت عظمیٰ نصیب ہو جائے۔

اس فیصلے کو ایک تاریخی فیصلہ قرار دیا جا رہا ہے ' اور بجا طور پر دیا جا رہا ہے - لیکن جہاں تک ججوں کے تقرر اور ان کے مناصب کو حکومت کی من مانی کارروائیوں کے چنگل سے آزاد کرنے کا تعلق ہے ' تو یہ تو کوئی غیر معمولی چیز نہیں - یہ تو اتنا معروف و مسلم اصول ہے کہ ہر ملک جسے مہذب ہونے کا دعویٰ ہے وہاں اس کا اہتمام موجود ہے - پھر صرف اتنا کرنا یہ بات یقینی بنانے کے لیے کافی بھی نہیں ہو گا کہ جج حضرات ' قانون کی حکومت قائم کرنے کے لیے اپنا آئینی کردار ادا کرنا شروع کر دیں - اس لیے کہ جب ان کا تقرر اور منصب ' انتظامیہ کی دست برد سے محفوظ تھے ' تب بھی وہ اپنا یہ کردار پوری طرح ادا نہیں کرتے رہے ہیں - اسی طرح یہ فیصلہ کوئی منفرد نوعیت بھی نہیں رکھتا - آج سے ۵ سال قبل ۱۹۹۱ میں ' بھارت کی سپریم کورٹ بھی ایسا ہی فیصلہ دے چکی ہے ' جہاں کے دستور کی دفعات ہمارے دستور سے مماثل ہیں - اس فیصلے میں کسی ایسی عدالتی فعالیت (Judicial activism) کا مظاہرہ بھی نہیں کیا گیا ' جس طرح کی فعالیت کے ذریعے امریکہ اور انگلستان جیسے ممالک میں عدالتیں ' دستوری اور سماجی نظام میں انقلابی تبدیلیاں لا چکی ہیں - یہ تو دستور کی دفعات کی بڑی محتاط اور سیدھی سادی تشریحات پر مبنی ہے - حکومت کی مزاحمت کی وجہ کچھ اور ہی ہے -

پھر اس فیصلے کی وہ کیا حقیقت اور نوعیت ہے ' جو اسے تاریخی بناتی ہے؟ ہمارے خیال میں ' سپریم کورٹ نے اس فیصلے کے ذریعے ' دراصل ملک کے اعلیٰ اور طاقت ور حکمرانوں کی مطلق العنانیوں ' قانون شکنیوں اور نظام و عوام کے خلاف چیرہ دستیوں کو لگام دی ہے - ایسے حکمرانوں کو نہیں جو اقتدار سے ہٹ چکے ہوں ' بلکہ ایسے حکمران جو فیصلے کے وقت مسند اقتدار پر دندنا رہے ہیں ' طاقت کے نشے میں چور ہیں ' اور منتخب بھی ہیں ' گویا "جمہوری قبا میں دیو استبداد" بنے ہوئے ہیں ' (بلکہ دیوی کہا جائے تو زیادہ مناسب حال ہو گا) - ایسے طاقت ور لوگوں کی قانون شکنی کو ' عدلیہ نے جائز قرار دینے یا اس پر لیپا پوتی کرنے کے بجائے دو ٹوک الفاظ میں قانون شکنی ہی قرار دیا ہے ' اور انھیں اس سے رک جانے ہی کا نہیں ' اس کا مداوا کرنے کا بھی حکم دیا ہے -

یہ بات بہت اہم ضرور ہے کہ یہ قانون شکنی --- جو اونچے لوگ تو ہر دائرے میں برابر کرتے چلے آ رہے ہیں --- اس دائرے میں روکی گئی ہے جو عدلیہ ہی کو تباہ کیے دے رہی تھی - اس عدلیہ کو جو آئینی طور پر قانون شکنی روکنے کی ذمہ دار ہے - لیکن اصل اہمیت اسی بات کی ہے کہ عدالت نے طاقت ور حکمرانوں کو بتایا ہے کہ وہ انھیں حکمرانی کرتے ہوئے قانون و انصاف کی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دے گی -

عدالتوں کی جانب سے حکمرانوں پر قانون کی حکومت قائم کرنے کا کام بھی ' متعدد ممالک میں معمول کے مطابق ہوتا رہتا ہے - اور ہمارے ہاں تو دستور کی دفعات ۱۸۴ اور ۱۹۹ ' واضح طور پر یہ کردار اعلیٰ عدالتوں کے سپرد کرتی ہیں لیکن جس بات نے عدالت کے اس فیصلے کی اہمیت کو کئی گنا بڑھا

دیا ہے، اور فی الواقع اس کو تاریخی بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ نصف صدی میں یہ تیسرا ہی فیصلہ ہے [۱۹۵۴ میں مولوی تمیز الدین خاں کیس میں سندھ ہائی کورٹ کے، اور ۱۹۹۳ میں نواز شریف کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد] جس میں عدالت نے قائم و بااختیار، اعلیٰ ترین حکمرانوں کی دستور و نظام کے خلاف قانون شکنی کو قانون شکنی قرار دیا ہے، اور اس کا مداوا بھی کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہماری عدالتی تاریخ میں اعلیٰ حکمرانوں کو قانون کی حدود میں رکھنے کی بھی بے شمار روشن مثالیں موجود ہیں، ہمارے متعدد جج بھی تابناک کردار کے حامل رہے ہیں۔ لیکن یہ قانون کی حکومت یا تو جزوی دائروں میں افراد اور اداروں کے حق میں قائم کی گئی، یا غیر حاضر و بے اختیار حکمرانوں کے خلاف۔ لیکن، ہم پورے ادب کے ساتھ کہنا چاہیں گے کہ، جہاں دستور و نظام کا مسئلہ ہوا، یا ریاستی اداروں کا، یا حکمران قائم و بااختیار ہوئے، وہاں عدالتیں نہ صرف اپنا آئینی کردار ادا کرنے سے قاصر رہی ہیں، بلکہ انھوں نے حکمرانوں کی دستور شکنی تک کو سند جواز عطا کی ہے۔ ۱۹۵۴ میں گورنر جنرل غلام محمد کی طرف سے ملک کی بانی دستور ساز اسمبلی کی برخواستگی کے کیس میں جسٹس منیر کورٹ کی طرف سے سند جواز عطا کرنے سے لے کر، ۱۹۹۴ میں صابر شاہ کیس میں حالیہ سپریم کورٹ کی طرف سے حکومت کے غیر آئینی فیصلوں کی بالواسطہ تصویب تک --- یہ ایک طویل اور تکلیف دہ داستان ہے۔ حکمرانوں نے بار بار منتخب و مقتدر پارلیمنٹ کو کان پکڑ کے نکال باہر کیا، جو دستور ان کے وجود کا سرچشمہ تھا اور جس کے ساتھ وفاداری کا حلف وہ اٹھائے ہوئے تھے، اسی کو منسوخ کیا، معطل کیا، اس کی من مانی مرمت کی، بنیادی حقوق غصب کیے، خود عدالتوں ہی پر شب خون مارا۔ ان قومی جرائم کے مقابلے میں عدالتوں نے ہمیشہ فدویت کی راہ میں عافیت ڈھونڈی: انھوں نے ان اقدامات کو جائز ٹھیرایا، ان حکمرانوں کے ہاتھ میں وہ قانونی و آئینی ہتھیار تھما دیے جن سے انھوں نے آئین اور عدلیہ کا حلیہ بگاڑ دیا، ورنہ خاموشی اختیار کی۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عدلیہ، قانوناً سب سے بالا مگر عملاً سب سے کمزور ادارہ ہے۔ اس کے پاس نہ فوج اور پولیس ہے، اور نہ خزانہ و مراعات، کہ وہ قوت یا ہارس ٹریڈنگ کے بل پر اپنی بات منوالے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے ججوں نے یہ راہ عافیت کوشی کی خاطر نہیں، خود کو بے بس پاکر اختیار کی ہوگی (جیسا جسٹس منیر نے اعتراف کیا)، اگرچہ بے بسی عموماً ایک معروضی حقیقت سے زیادہ اپنی نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے، یا انھوں نے ملک کے مفاد میں بہتر سمجھا ہوگا کہ ان قانون شکنیوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیں تاکہ حکومت اور عدلیہ کے درمیان محاذ آرائی نہ ہو۔ لیکن اس کی کیا تاویل ہوگی کہ ضمانت پر رہائی جیسے معمولی سے معاملے میں بھی، لوگ جانتے ہیں، اگر حکومت نہ چاہے تو سپریم کورٹ تک سے ضمانت ملنا محال ہوتا ہے۔ آج بھی بے شمار معروف لوگ طویل عرصے سے سلاخوں کے پیچھے ہیں، ان کے خلاف مقدمہ بھی نہیں چلتا، ان کو ضمانت پر رہائی بھی نہیں ملتی۔ بہرحال

وجہ کچھ بھی ہو' یہ سب کچھ بے بسی کی بنا پر ہوا یا مصلحت کی خاطر' ایک دردمند شہری بار بار یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر..... اگر.....

ایسے میں' ہمارے نزدیک یہ فیصلہ دراصل اس لیے تاریخی ہے کہ سپریم کورٹ نے ' اپنی تاریخ میں دوسری دفعہ' ایک مطلق العنان حکومت کو دستور شکنی سے روک دیا ہے۔

ہماری اس بات کی تائید محترمہ وزیراعظم اور حکومت کی روش کرتی ہے۔ اگر معاملہ صرف چند ججوں کے آنے اور جانے کا ہوتا تو وہ اتنی چراغ پا نہ ہوتیں' یوں سپریم کورٹ کے خلاف جنگ نہ چھیڑتیں۔ یقیناً ان کے غصے میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ صدر' فوج اور امریکہ کی تین اطراف سے اپنے کو محفوظ پانے کے بعد' اور اپوزیشن کو کونے سے لگا دینے کے بعد---اپنی مطلق العنانی کو مکمل کرنے کے لیے عدلیہ کو اپنے قابو میں کرنے کا جو منصوبہ وزیراعظم بنا رہی تھیں وہ اس فیصلے سے درہم برہم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ وہ خوب جانتی ہیں کہ اگر ایک دفعہ عدلیہ نے حکومت کے فیصلوں اور اقدامات کو قانون کی' بلکہ انصاف کی بھی' ترازو پر تولنے اور غیر قانونی اور غیر منصفانہ اقدامات روکنے کے اختیار پر عمل درآمد شروع کر دیا تو پھر حکومت اوپر سے لے کر نیچے تک ہر دائرے میں قانون کا پابند ہونے پر مجبور ہوگی' اور وہ کوئی من مانا کام نہ کر سکیں گی۔ ظاہر ہے وہ ایسی حکومت کرنے کے لیے نہیں "پیدا" ہوئی ہیں۔ ابھی تو وہ ٹائمز میگزین (لندن) کی طرف سے "دنیا کی طاقت ور ترین خاتون" قرار دیے جانے کے نشے سے مخمور ہی تھیں' کہ سپریم کورٹ کے فیصلے نے ان کا مزہ کرکرا کر دیا۔ عدلیہ کے بارے میں ہی ان کے سنہرے خواب نہیں ٹوٹے' مستقبل کے بارے میں بھی ڈراؤنے خواب ان کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ اس لیے وزیراعظم کا ردعمل ہمارے لیے بالکل حیران کن نہیں' بلکہ بالکل قابل فہم ہے' اگرچہ انتہائی افسوس ناک ضرور ہے۔ وہ گربہ کشتن روز اول کے اصول پر عمل پیرا ہیں۔

ایک سانس میں وہ عدلیہ کی آزادی اور اس کے فیصلوں کی پابندی کا دم بھرتی ہیں' دوسری سانس میں وہ سپریم کورٹ کے خلاف انتہائی گھٹیا اور رکیک لب و لہجہ اور الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ وہ کچھ کہتی ہیں جسے اخبار نویس نقل کرنے سے بھی عاجز ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایسی تصویر بنتی ہے جیسے کوئی روایتی جھگڑالو خاتون کھڑی ہیں' چہرہ سرخ ہے' رگیں پھول رہی ہیں' منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں' اول فول بک رہی ہیں' آستینیں چڑھی ہوئی ہیں اور ان کا بس نہیں چل رہا کہ سپریم کورٹ' صدر' اپوزیشن' میڈیا اور جانے کس کس کا بھرکس نکال دیں۔

کبھی وہ صدر کے پاس جاتی ہیں کہ ججوں پر آئین سے غداری کے جرم میں مقدمہ چلایا جائے' کبھی چیف جسٹس کو برطرف کرنے کا حکم جاری کرنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ کبھی آرڈی ننس کے ذریعے

اس فیصلے کو کالعدم کرانا چاہتی ہیں ۔ کبھی کہتی ہیں کہ یہ فیصلہ غصے میں لکھا گیا ہے ' کبھی یہ کہ ذاتی انتقام کی خاطر ۔ کبھی کہتی ہیں کہ فرد واحد کی مرضی نہیں چلے گی ' پتا نہیں چلتا کہ فرد واحد سے ان کی مراد چیف جسٹس ہیں یا صدر ؟ کبھی مقننہ کی آزادی و بالا تری کی دہائی دیتی ہیں ' جس سے ان کی مراد اپنی بالا تری ہوتی ہے ' اس لیے کہ پارلیمانی کابینائی نظام میں مقننہ اور حکومت یک جان و دو قلب بن چکے ہیں ۔ کبھی کہتی ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حکومت پیپلز پارٹی کی ہو اور جج جماعت اسلامی کے لگائے جائیں ' اس طرح تو حکومت کا نظام تباہ ہو جائے گا ۔

ہم وزیراعظم کے ذاتی حملوں اور رکیک الزامات کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان کا نوٹس لیا جائے ۔ ان کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ انھوں نے ' ان کے حواریوں نے ' اور چند سنجیدہ حلقوں نے اس فیصلے پر جو قانونی و آئینی اعتراض اٹھائے ہیں ' ان کا بھی کافی جواب دیا جا چکا ہے ۔ لیکن ان میں سے چند مباحث ایسے ہیں جن پر مزید گفتگو ضروری محسوس ہوتی ہے ۔ ان مباحث کا بڑا گہرا اور بنیادی تعلق ' ملک میں قیام عدل اور ایک اسلامی و جمہوری ریاست و معاشرے کے قیام سے ہے ۔

پہلا مبحث ایک منتخب ' جمہوری حکومت اور عدلیہ کے درمیان اختیارات کی تقسیم سے متعلق ہے ۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی بڑے زور و شور سے یہ بات اٹھائی گئی کہ عدلیہ نے منی آئین بنایا ہے ' انتظامیہ کے دستوری اختیار پر پابندی لگائی ہے ' دستور کی ایک شق کو کالعدم قرار دے دیا ہے ' وغیرہ وغیرہ ۔ اصل ساورن (Sovereign - مقتدر) ادارہ پارلیمنٹ ہے جو عوام کی منتخب کردہ ہے ' آئین میں ترمیم اس کا کام ہے ' یہ فیصلہ ایک عوامی ادارے کے اختیارات میں مداخلت ہے ۔ شریعت بل کے وقت بھی پارلیمنٹ کے ساورن ہونے کا نعرہ بلند کر کے ' پورے پارلیمانی نظام کو شریعت کے دائرے سے باہر قرار دلوایا گیا تھا ۔ اس ضمن میں بار بار برطانیہ کی مدر (mother) پارلیمنٹ کی مثال بھی دی جاتی ہے ۔ وقت آ گیا ہے کہ پارلیمنٹ کی ساورنٹی کے افسانے (myth) کو بے نقاب کر دیا جائے ۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ' قانوناً ' اصل ساورن دستور ہے ۔ اس دستور میں پارلیمنٹ کی مطلق ساورنٹی اور بالا تری کا دور دور پتا نہیں چلتا ۔ یہ صحیح ہے کہ قانون وہی بنا سکتی ہے ' لیکن قانون کے دائرے میں عدلیہ کا اختیار اس سے بالا تر ہے ۔ عدلیہ کو دستور و قانون کی تعبیر و تشریح کا اختیار ہے ' اور یہ حتمی اختیار ہے ۔ حکومت اور پارلیمنٹ ' سب اس کی تعبیر و تشریح کے پابند ہیں ۔ عدلیہ ' عوام کی نمایندہ پارلیمنٹ کے منظور کیے ہوئے جس قانون کو دستور سے متصادم قرار دے ' وہ اس کو کالعدم کر سکتی ہے ' وزیراعظم کے وکلا یا ان کے جیورسٹ دوست کچھ بھی کہتے رہیں ۔ اسی طرح '

دستور کے مطابق' پارلیمنٹ کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی جو قرآن و سنت کے خلاف ہو' نہ کسی صوبے کی اجازت کے بغیر اس کی حدود میں تغیر کر سکتی ہے۔ یہ عجیب بے بس ساورنٹی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دو تہائی اکثریت سے دستور میں ترمیم کا اختیار بلاشبہ پارلیمنٹ کے پاس ضرور ہے۔ اس سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکومت' دو تہائی اکثریت کی بل پر' دستور میں جو چاہے ترمیم کر سکتی ہے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو بھی کالعدم کر سکتی تھی' اگر اس کے پاس دو تہائی اکثریت ہوتی۔ اس طرح بالآخر سب سے مقتدر حکومت اور پارلیمنٹ ہی ٹھہرے' کہ دستور کو بھی بدل سکتے ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ قانوناً حکومت الگ چیز ہے اور پارلیمنٹ الگ' اور حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ لیکن ہم حکومت میں پارلیمنٹ کو شامل سمجھ کر بات کر رہے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی پارلیمانی جمہوریت میں' اور خصوصاً پاکستان میں' عملاً یہی صورت حال ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانیہ میں پارلیمنٹ نے بالاتری تو انتظامیہ (بادشاہ) کے مقابلے میں حاصل کی تھی' لیکن بالآخر وہ "بادشاہ" کے وزرا کے ماتحت ہوگئی ہے۔ جن کی اکثریت ہوتی ہے' وہی وزیر بنتے ہیں' پھر وہ وزیر اپنی اکثریت کے بل پر ہر قسم کے قانونی اور انتظامی فیصلوں اور اقدامات کے اختیار کے مالک ہوتے ہیں۔ اب جھگڑا مقننہ بمقابلہ انتظامیہ نہیں' انتظامیہ و مقننہ بمقابلہ عدلیہ و عوام ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ دلچسپ بحث ہے۔ (برطانوی ہائی کورٹ کے جسٹس لاز (Laws) اسے "جمہوری استبداد" (democratic tyranny) سے تعبیر کرتے ہیں)۔

بہ غور دیکھا جائے تو پارلیمنٹ کی یہ مطلق بالاتری صرف ظاہری و قانونی ہے' حقیقی نہیں کہ استعمال ہو سکے۔ اختیار ہونے کے باوجود' کیا پارلیمنٹ دستور میں ترمیم کر کے اپنی مدت میں غیر معینہ توسیع کر سکتی ہے؟ کیا وہ بنیادی حقوق ختم کر سکتی ہے؟ کیا وہ صوبائی خود مختاری ختم کر کے وحدانی حکومت قائم کر سکتی ہے؟ کیا وہ عدلیہ کو ختم کر سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ عملاً ان میں سے کوئی ترمیم نہیں کر سکتی۔ ہم آگے بڑھ کر پوچھتے ہیں کہ کیا وہ قرارداد مقاصد حذف کر سکتی ہے؟ کیا وہ اسلام کا مقام بہ حیثیت ریاست کے مذہب کے نکال سکتی ہے؟ کیا وہ اپنے اوپر سے یہ پابندی ختم کر سکتی ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف قانون نہ بنائے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ' خواہ دستور میں لکھا نہ ہو' مگر دستور کے کچھ حصے ناقابل ترمیم ہیں۔ پوری پارلیمنٹ متفقہ طور پر بھی قانون سازی کے ذریعے ان کو ختم نہیں کر سکتی۔ ان کو صرف کوئی انقلاب ہی ختم کر سکتا ہے' عوامی ہو یا فوجی۔ دیکھا جائے تو ان میں سے کسی سے اسلام ختم ہوتا ہے' کسی سے جمہوریت' کسی سے قیام عدل' کسی سے ملک کے باشندوں کا یہ حق کہ حکومت ان کی مرضی سے

آئے اور جائے' کسی سے ان کے بنیادی حقوق' اور کسی سے ملک کی وفاقی حیثیت۔

اس حقیقت کو بنیاد بنا کر' بھارت کی سپریم کورٹ ایک فیصلہ کر چکی ہے جو فی الواقع انقلابی نوعیت کا ہے۔ اندرا گاندھی نے دستور میں ترمیم کی اور کچھ بنیادی حقوق حذف کر دیے۔ سپریم کورٹ نے پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت سے منظور کردہ دستوری ترمیم کو اس بنیاد پر کالعدم کر دیا کہ یہ دستور کی بنیادیں ہیں اور ان میں ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے کوئی نص خود دستور میں یا کہیں بھی موجود نہ تھی' صرف بانیان دستور کی نیت اور ارادے سے استدلال ممکن تھا۔ حکومت' پارلیمنٹ' عوام سب نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا' حالانکہ یہ صریحاً دستور سے ماورا فیصلہ تھا۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہماری سپریم کورٹ نے ججوں کے شریعت کورٹ میں تبادلے کے بارے میں ۲۰۳ سی کے نفاذ کو مسترد کرنے کے لیے بھارتی سپریم کورٹ کی طرح' اس مضبوط دلیل کو بنیاد کیوں نہ بنایا' کہ عدلیہ کی آزادی کسی بھی ترمیم سے ناقابل تنسیخ ہے' اور کیوں یہ کمزور استدلال اختیار کیا کہ کیوں کہ ۲۰۳ سی مارشل لا کی داخل کردہ ہے' اس لیے مرجوح ہے۔

ہمارے ہاں دستور پارلیمنٹ سے بالاتر قانون ہے' اگرچہ بظاہر اس کی دو تہائی اکثریت سے بالاتر نہیں' مگر خود برطانیہ میں بھی' جہاں کوئی تحریری دستور نہیں' جہاں پارلیمنٹ (Queen in Parliament) فی الواقع مقتدر اعلیٰ ہے' اس کی قانون سازی پر کوئی پابندی نہیں' اور اس کے کسی قانون کو کالعدم نہیں قرار دیا جا سکتا' یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ ایک قانون ایسا ضرور ہے جو پارلیمنٹ سے بھی مقدم اور بالاتر ہے۔ ایسا نہ ہو تو خود پارلیمنٹ کے مطلق اختیار کی کوئی قانونی بنیاد نہیں رہ جاتی۔ سالمند (Salmond) اپنی کتاب جیورس پروڈنس میں اسے "حتمی قانونی اصول" (ulitmate legal principle) کا نام دیتا ہے۔ سر ولیم ویڈ (Wade) کہتے ہیں کہ "یہ ایسا اصول ہے جو اس لحاظ سے بنتا ہے کہ کوئی پارلیمنٹ اس کو بدل نہیں سکتی۔ اس کی حفاظت عدالت کی تحویل میں ہوتی ہے' اور پارلیمنٹ کا کوئی ایکٹ یہ اختیار اس سے واپس نہیں لے سکتا"۔ (کرنٹ لا جرنل' ۱۹۵۵' ص ۱۷۲)۔ ہائی کورٹ کے جسٹس سر جان لاز (Laws) اس کو اعلیٰ تر قانون (higher-order law) کا نام دیتے ہیں' اور اس کی بالاتری کی بحث بڑے اہم انداز میں اٹھاتے ہیں: جمہوریت کی بقا اور نشوونما خود اس بات کی متقاضی ہے کہ جو سیاسی جمہوری اختیارات استعمال کرتے ہیں ان پر تحدید ہو' اور وہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کریں... [اسی طرح] بنیادی حقوق کے تحفظ کا تقاضا ہے کہ ان کے لیے ایک بالاتر قانون ہو جسے دوسرے قوانین کی طرح صرف درکار اکثریت کے ذریعے منسوخ نہ کیا جا سکے۔ ورنہ ان حقوق کی کوئی ضمانت نہیں۔ پھر یہ حقوق نہیں' مراعات ہیں۔ اس لیے حاصل ہیں کہ حکومت دے رہی ہے' اس لیے نہیں کہ حق ہے۔ ایک منتخب حکومت کو یہ

اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ دستور کی ان بنیادوں کو منہدم کر دے .... ہر مستبد حکمران یہی کہتا ہے کہ میرا ہر لفظ قانون ہے۔ اگر ایک منتخب ادارہ بھی یہی دعویٰ کرے کہ اس کا اختیار قانون سازی کسی تحدید یا نقد و نظر کا پابند نہیں' تو وہ مستبد کیوں نہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ دستور کی بنیادیں حکومت کی تحویل میں نہ ہوں' کوئی حکومت اپنی اکثریت سے ان کو تباہ نہ کر سکے۔ وہ عدالت کی تحویل میں ہوں۔ اگر حکمرانی قانون کے مطابق ہونا ہے تو یہ ناگزیر ہے۔ (پبلک لا' ۱۹۹۵' ص ۸۱-۸۵)

خوش قسمتی سے ہمیں "دو مبہم مطلق" چیزوں کی تلاش میں' اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس اللہ کی حاکمیت اعلیٰ اور قرآن و سنت کی صورت میں' بالاترین اور ناقابل تغیر و تبدل قانون - لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ - موجود ہیں۔ ہم نے ان کو اپنے دستور کا حصہ ضرور بنا لیا ہے مگر یہ دوسری دفعات کے مقابلے میں ناقابل ترمیم ہیں۔ "قرارداد مقاصد" اور "اسلام بحیثیت ریاست کا مذہب"، جس کا منبع بھی قرارداد مقاصد ہی ہے' اسی دستوری حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ جب قوم نے تسلیم کر لیا کہ حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور زندگی قرآن و سنت کے مطابق گزارنا ہے' تو ریاست کا مذہب اسلام ہو ہی گیا۔

یہ دونوں دفعات دستور کا حصہ بھی ہیں' اور دوسری دفعات سے بالاتر بھی۔ پھر دستور کے دوسرے حصے ہیں جو قرآن و سنت کی نصوص سے اجماعاً ثابت ہیں' اور جن پر پاکستان میں اجماع منعقد بھی ہو چکا ہے یعنی عدل کا قیام' یہ اسلام کے احکام میں سرفہرست اور سب سے مقدم ہے۔ ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان۔ بنیادی حقوق' یہ سب نصوص سے ماخوذ ہیں' اللہ اور اس کے رسولؐ کے دیے ہوئے ہیں' کسی جدید کنونشن سے ماخوذ نہیں۔ جمہوریت' یعنی عوام کا یہ حق کہ امور مملکت ان کے مشورے اور مرضی سے چلائے جائیں اور حکمرانوں کا عزل و نصب ان کے اختیار میں ہو' یہ بھی نص قرآنی ہے اور چودہ سو سال سے امت میں متفق علیہ۔ ملک کی وفاقی حیثیت کا مدار براہ راست کسی نص پر نہیں' لیکن پاکستان ایک سماجی و سیاسی معاہدے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ وفاق اس معاہدے کا جز ہے' اسی بنیاد پر صوبے اس میں شامل ہیں۔ اس معاہدے کی پابندی اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اور وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اور اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ کے تحت لازم ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی کسی بھی جمہوری حکومت کو --- ۱۰۰ فی صد اکثریت سے بھی --- منسوخ کرنے کا اختیار نہیں ہے' اور نہ ہونا چاہیے۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ دستور کی ان دفعات کی بالاتری کو سپریم کورٹ "آئین کی تشریح و تعبیر کے ذریعے دستور کا حصہ بنا دے۔ اب اس فیصلے میں ۲۰۹ کو ۲۰۳ سی سے بالاتر قرار دے کر' سپریم کورٹ نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ دستور کی ایک دفعہ دوسری دفعہ کو غیر موثر

کر سکتی ہے۔

اگر یہ اصول پہلے سے تسلیم کیا ہوا ہوتا' تو شریعت کورٹ میں تبادلے کے بارے میں ۲۰۳ سی کو اسلام میں قیام عدل کی نصوص سے ' قرارداد مقاصد میں عدلیہ کی آزادی کی ضمانت کی شق سے متصادم ہونے کی بنا پر بھی کالعدم قرار دیا جا سکتا تھا' اور کم سے کم شریعت کورٹ کے ججوں کی شرائط ملازمت تو واضح طور پر' ۲۰۳ سی کی طرح' ۲۰۹ سے متصادم ہیں۔ ان شرائط کے بارے میں کوئی درخواست دائر ہو تو اس کا فیصلہ اس فیصلے سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے' جبکہ یہ نظیر ہی کا کام نہیں کرے گا' نافذ العمل بھی ہو گا۔

دوسرا اہم مبحث' انتظامیہ کے اختیارات کی حدود کا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ججوں کے تقرر کے سلسلے میں مشورے کی یہ تعبیر - کہ قابل قبول منفی وجوہات کی عدم موجودگی میں حکومت' چیف جسٹس کے مشورے پر عمل کی پابند ہے۔ حکومت کے اختیار پر ایک خلاف دستور پابندی ہے۔ وجوہات بتانے کا مطالبہ' دفعہ ۴۸ (۲) کے خلاف ہے جو عدالت کو وزیراعظم کے مشورے کے بارے میں انکوائری سے روکتی ہے۔

"مشورے" کی تعبیر کے بارے میں فیصلے میں طویل اور مضبوط دلائل دیے گئے ہیں۔ اس موضوع پر کسی مزید گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کی تعریف معاملے کی نوعیت پر منحصر ہو گی جو متعین کرنے کا اختیار صرف سپریم کورٹ ہی کو ہے۔ ظاہر ہے کہ چیف جسٹس کا مشورہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے لیے دستور میں درج نہیں کیا گیا۔ اس کا مقصد اہل افراد کا تقرر یقینی بنانا ہے۔ اسی مقصد کے لیے سپریم کورٹ نے وہ تعبیر ضروری سمجھی ہے جو فیصلے میں درج ہے۔ لیکن اس مسئلے پر قیام عدل کے وسیع پس منظر میں غور و فکر ضروری ہے' اس لیے کہ یہ حکمرانوں کے اختیارات کے استعمال کو عدل پر قائم رکھنے کے مسئلے کا ایک حصہ ہے۔

قیام عدل' قانون کے سامنے مساوات اور قانون کے یکساں تحفظ کے مقاصد صرف مجرموں کو سزائیں دینے سے حاصل نہیں ہوتے۔ قیام عدل' قانون کی حکومت قائم کرنے کا نام ہے' تاکہ کوئی کسی کا حق نہ مار سکے' خصوصاً کوئی طاقت ور کسی کمزور کے ساتھ زیادتی یا ناانصافی نہ کر سکے۔ کیونکہ اصل طاقت ور وہ ہیں جن کے پاس حکومت کی قوت ہوتی ہے' اس لیے قیام عدل کے معنی' خصوصاً اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ کوئی حکومتی یا پبلک عہدے دار یا ادارہ - چھوٹا ہو یا بڑا' منتخب ہو یا غیر منتخب' صدر ہو یا وزیراعظم' فوجی جرنل ہو یا سول سیکرٹری' تھانے دار ہو یا پٹواری' جو لوگوں کے ساتھ کوئی بھی معاملہ کرنے کے لیے کسی بھی اختیار اور طاقت کا حامل ہے' وہ -- قانون اور اپنی حدود سے

تجاوز نہ کرنے پائے 'نہ کسی کے ساتھ بے انصافی اور ظلم کا مرتکب ہو 'نہ کسی کا حق مارے ۔اس مقصد کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ تمام حکومتی اہل کار اور ادارے 'اپنے فیصلوں اور اقدامات کے لیے عدالتوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔

قرآن و سنت میں ظلم اور عدل کے بارے میں بے شمار نصوص میں 'اس قیام عدل کے التزام کی شدت کے ساتھ تاکید موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی ساتھ ساتھ 'اپنے قائم بالعدل ہونے پر خود اپنی 'فرشتوں کی اور تمام اہل علم کی گواہی دی ہے (آل عمران ۳: ۱۸)۔ مولانا اصلاحی کے الفاظ میں ''عدل و قسط کا درجہ صفات الٰہی میں اتنا بلند و ارفع ہے کہ توحید کے بعد سب سے پہلے جس کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ قائم بِالْقِسْطِ ہے ۔''قسط کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق 'عدل اور انصاف وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں ۔اس کا ضد ظلم 'جور اور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں''۔انسان کی فطرت گواہ ہے کہ خالق نے انسان کو عدل پسند بنایا ہے 'تاریخ گواہ ہے کہ وہ دنیا کو''ایک نظام عدل و قسط کے تحت چلا رہا ہے''۔ کائنات گواہ ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خالق نے ''ایک میزان رکھی ہے''۔ اور وہ خود''عدل و قسط کو پسند کرتا ہے 'یہ نہیں چاہتا کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس عدل و قسط سے بال برابر انحراف کرے''۔ چنانچہ وہ کہتا ہے''دیکھو میزان کے معاملے میں تجاوز نہ کرو۔ بلکہ انصاف کے ساتھ وزن قائم کرو۔ اور نہ میزان میں کوئی کمی کرو''۔ (الرحمن ۵۵: ۸۔۹)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجنے اور کتاب و میزان اتارنے کی غایت بھی یہی بیان فرمائی ہے: ''تاکہ لوگ قسط پر قائم ہو جائیں'' (الحدید ۵۷: ۲۵)۔امت کا مقصد بھی اس نے یہی متعین کیا ہے: ''اللہ کے لیے 'قسط کو قائم کرنے والے اور قسط پر گواہ بنو'' (النساء ۴: ۱۳۵ 'المائدہ ۵: ۸)

اسی قیام عدل کے لیے اس نے اپنے اوپر بھی ظلم کو حرام کیا ہے 'اور بندوں کے مابین بھی ۔پھر اس نے قیام عدل کے لیے انسانیت کے واسطے پوری امت پر سے 'مجموعی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ سب سے بڑا معروف 'توحید کے بعد عدل ہی ہے 'اور سب سے بڑا منکر 'شرک کے بعد ظلم ۔پھر مسلمانوں کے درمیان یہ ذمہ داری تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر ڈالی ہے ' وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ ایک گروہ کا لازماً موجود رہنا جو یہ کام کرے 'ضروری قرار دیا ہے ' وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ' الخ۔ سیاسی اختیار ملے تو اولین فرائض میں اس کو شامل کیا ہے ' اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ' لوگوں کے درمیان تمام فیصلہ کرنے والوں کو حکم دیا

کہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ۴: ۵۸) اور فیصلہ کرو تو ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو' وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۵: ۴۲)۔ تفصیل کا وقت نہیں، لیکن نبی کریمؐ سے لے کر بڑے بڑے دنیا دار اور مطلق العنان بادشاہوں تک اگر ہماری تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ حکمران عام آدمیوں کی طرح عدالتوں کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے' تو یہ قرآن اور رسول اللہؐ کی انھی تعلیمات کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ریاست اور دستور کے لیے چارٹر وہ ہے جو خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد' اپنے افتتاحی خطاب میں پیش کیا: "میں ایک انسان ہی ہوں' صحیح بات بھی کرتا ہوں اور غلط بھی۔ اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرنا' اگر میں غلط کام کروں تو مجھے ٹھیک کر دینا.... دیکھو' تم میں سب سے زیادہ طاقت ور میرے نزدیک سب سے کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کر لوں' اور تم میں سب سے کمزور میرے نزدیک سب سے طاقت ور ہے' یہاں تک کہ میں اس کے لیے اس کا حق وصول کر لوں"۔ یہی کلمات حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمائے۔ اسی لیے وہ اپنے گورنروں کا خود احتساب کرتے تھے' ان کو سزائیں بھی دیتے تھے اور ان سے حق اور قصاص بھی دلواتے تھے۔ اگر کسی گورنر نے کسی کو غلط کوڑے مارے ہوتے تھے تو مدعی کے ہاتھ میں کوڑا تھما دیتے کہ گورنر کو مارو۔

بدقسمتی سے ہمارا دستور یا ہمارا کوئی قانون اسلام کے ان احکام اور روایات کا پوری طرح حامل نہیں ہے۔ بلکہ الٹے' دستور میں ان احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ۲۴۸ کے تحت تمام منتخب حکمرانوں کو اپنی حکومتی اختیارات کے استعمال یا فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں ہر قسم کی عدالتی جواب دہی سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے' بلکہ اس سے بڑھ کر' دوران عہدہ ہر قسم کی عدالتی کارروائی سے بھی۔

ہاں' حکمرانوں کو خلاف قانون کاموں سے روکنے اور قانون کے مطابق اقدامات کرنے کے لیے' درخواست دیے جانے پر' پروانے اور احکام جاری کرنے کے اختیارات دفعہ ۱۹۹ کے تحت' ہائی کورٹ کو دیے گئے ہیں' اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی صورت میں سپریم کورٹ کو ازخود بھی احکام جاری کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ اختیارات ایک درجے میں اسلام کے بنیادی احکام کا تقاضا پورا کرتے ہیں اور حکومتی اہل کاروں اور اداروں کے فیصلوں کے عدالتی نقد و نظر کا دروازہ کھولتے ہیں' لیکن مختلف عوامل کی وجہ سے یہ نقد و نظر برائے نام ہی ہو رہا ہے: یہ عوامل' عوام کی غربت و جہالت' انصاف کی گرانی' حکومتی اہل کاروں کی طاقت' اور خود عدلیہ کی سردمہری اور محتاط روش' ہیں۔ خصوصاً جج حضرات قانون کی خلاف ورزی کی تعریف میں قانونی اختیارات کی لفظی تعبیر سے تجاوز سے آگے جانے کو عموماً تیار نہیں' اور انتظامیہ بھی اس سے زیادہ کچھ دینے کے لیے تیار نہیں۔

لیکن یہ بات اب ہمارے ہاں متعدد مقدمات میں آچکی ہے کہ حکمرانوں کے فیصلوں کے سلسلے میں عدالت قانونی الفاظ سے آگے بڑھ کر' بدنیتی یا طریق کار کی بے انصافیوں یا فطری انصاف کے اصولوں کی خلاف ورزی کا کھوج بھی لگا سکتی ہے۔ جونیجو اسمبلی کی برطرفی کے بعد' یہ بات بھی طے ہو گئی کہ صدر کے خالص صوابدیدی اختیارات کے استعمال کو' نامعقولیت اور مبنی برانصاف نہ ہونے کی بنیاد پر بھی عدالت کالعدم قرار دے سکتی ہے۔ نواز شریف کیس میں ایک محترم جج یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ چیف آف سٹاف کا تقرر بھی عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں۔ اتنی روایات اور فیصلوں کی روشنی میں' سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ کہ --- اس کی سفارش قبول نہ کیے جانے کی صورت میں اسے وجوہات بتائی جائیں' اور معقول منفی وجوہات نہ ہوں تو مشورہ قبول کیا جانا چاہیے --- کسی طرح بھی انتظامیہ کے اختیار میں مداخلت نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ صدر یا حکومت کے جس حکم سے دستور کے بنیادی مقاصد مجروح ہوتے ہیں یا جس کو جاری کرنے میں قانون' انصاف یا معقولیت کے تقاضے مجروح ہوتے ہوں' عدالتیں اس کا جائزہ لے سکتی ہیں اور اس کو صحیح کر سکتی ہیں۔

منتخب حکمرانوں کا عدالتی جواب دہی سے استثنا تو اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب دفعہ ۲۴۸ کو دفعہ ۲ اور ۲۔اے کے متناقض قرار دے کر اس پر عمل درآمد ختم کر دیا جائے۔ لیکن ایسا نہ بھی ہو تو قرارداد مقاصد' مذہب اسلام اور قیام عدل کے جو تقاضے ہیں' اب تک ہماری عدالتیں جو نظائر قائم کر چکی ہیں' انگلستان اور ہندوستان کی عدالتوں نے جو عدالتی فعالیت اختیار کی ہے اور کر رہی ہیں' ان کو سامنے رکھ کر ہماری عدالتیں کچھ سرگرمی دکھائیں تو ان کے لیے حکومت پر قانون کی حکومت قائم کرنے کے لیے بڑا میدان موجود ہے۔

بھارت میں عدالتوں کو اتنے ہی اختیارات ہیں جتنے ہمارے ہاں ہیں اور وہ بہت کچھ کر رہی ہیں۔ انگلستان میں عدالتوں کو ایسے کوئی اختیارات حاصل نہیں' کوئی ایکٹ آف پارلیمنٹ نہیں جو انھیں پبلک اہل کاروں اور اداروں کے فیصلوں اور اقدامات کے بارے میں عدالتی کارروائی کا اختیار دیتا ہو' لیکن گذشتہ ۳۰ سال میں' عدالتوں نے جوڈیشیل ریویو (عدالتی جائزہ یا نقد ونظر) کے نام پر اتنے اختیارات حاصل کر لیے ہیں اور پبلک لا کے نام سے اتنا وسیع قانونی نظام وضع کر لیا ہے کہ حیرت انگیز ہے۔ جہاں ساورن صرف پارلیمنٹ ہے' وہاں' ہائی کورٹ کے جج' سر اسٹیفن لیڈ لے لکھتے ہیں:

''گذشتہ تیس سال کی عدالتی نقشہ گری کا نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ ''پارلیمنٹ'' ختم ہو رہی ہے جس کے سامنے قانون کی حکومت بھی جھک جاتی تھی۔ اب دو محوری ساورنٹی ہے: ایک ''تاج''' بذریعہ پارلیمنٹ کی' اور دوسری ''تاج'' بذریعہ عدالت کی۔ ''تاج'' کے وزرا دونوں کے سامنے جواب دہ ہیں: سیاسی طور پر پارلیمنٹ کے سامنے' قانونی طور پر عدالت کے سامنے'' (پبلک لا'

۱۹۹۵، ص ۳۸۹)۔ یہ نتیجہ ہے اس نظریے کا کہ "عدل، قانون پر مقدم ہے، اور قانون کا بنیادی فریضہ طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کا تحفظ ہے"۔ یہ تصور کہ حقوق انسانی اور قانون کی حکمرانی کا بنیادی فریضہ طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کی حفاظت کرنا ہے، نری جذباتیت ہیں۔ یہ قانون کی نظروں میں سب کی یکسانیت اور مساوات کی پیداوار ہے" (ایضاً، ص ۳۹۷-۳۹۹)۔

سوچنا چاہیے کہ ہماری سپریم کورٹ، ازخود (سوموٹو) بنیادی حقوق کے تحفظ کے اختیار کو استعمال کرے، تو "قانون کی نظروں میں سب کی برابری" کے حق کے تحت کیا کچھ نہیں کر سکتی۔

دوسرے جج، سرجان لاز مزید وضاحت کرتے ہیں: "جوڈیشل ریویو کے لیے ہم ججوں کا دائرہ اختیار اب اتنا وسیع ہے کہ ہم اصولاً ہر پبلک باڈی (فرد یا ادارے) کے ہر فیصلے کی عدالتی نگرانی کر سکتے ہیں۔ اس سے کوئی فی الواقع مستثنیٰ ہے تو وہ پارلیمنٹ کا پاس کردہ قانون..... یہ استثنا بھی اب یوروپین یونین کے قانون کا پابند ہے.... "شاہی اختیار (Royal Prerogative) کے استعمال کو بھی [جو ہمارے ہاں صدر کے صوابدیدی سے بڑا اختیار ہے] اب ڈویژنل کورٹ کی سطح پر عدالتی دائرہ اختیار میں شامل کر لیا گیا ہے"۔ (پبلک لا، ۱۹۹۵، ص ۷۵)۔ وہ کہتے ہیں: جوڈیشل ریویو کے اصول اس تصور پر مبنی ہیں کہ ریاستی حکام کا کردار اخلاقی طور پر نیک اور بھلا ہونا چاہیے۔ چنانچہ صرف یہی نہیں دیکھا جاتا کہ ان کے فیصلے قانون کے الفاظ کے مطابق ہیں یا نہیں، بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ معقول ہیں یا نہیں، اختیارات کا استعمال منصفانہ ہے یا نہیں، جو طریق کار اختیار کیا گیا وہ منصفانہ ہے یا نہیں۔ قانونی اختیار کو بھی اتنا وسیع نہیں لیا جاتا جتنا الفاظ بتاتے ہوں۔ یہ سب اصول ججوں کے بنائے ہوئے ہیں، کسی پارلیمنٹ نے نہیں بنائے۔ ان کو قبولیت عام حاصل ہے۔ ان سے حکومت یا کسی منتخب ادارے کو اپنے اختیارات میں مداخلت محسوس نہیں ہوتی۔ (ایضاً، ص ۷۸ تا ۸۱)

ہم نے یہ تفصیل اس لیے بیان کی کہ، اسلام کے احکام کو تو جانے دیجیے، ہمارے ہاں تو صرف مشورے کو بامقصد اور کارگر بنانے پر یہ شوروغوغا ہے۔ ایک جدید سیکولر ریاست میں تو وزیر بھی عدالت کے سامنے جواب دہ بنائے جارہے ہیں، اور دیگر حکام بھی۔ اور ان کے احکام کو صرف لفظ قانون نہیں، بلکہ روح قانون اور مقصد قانون، قیام عدل اور طاقت ور کے خلاف کمزور کے تحفظ کے اصولوں پر جانچ کر ان کو حدود کا پابند کیا جارہا ہے۔ پھر یہ کام ہمارے ہاں کیوں نہ ہو جب کہ یہ اسلام کا عین تقاضا ہے اور ریاست فرد کی طرح اسلام کی پابند ہے کہ اس کا مذہب اسلام ہے۔

تیسرا اہم مبحث دفعہ ۲۰۹ کو ۲۰۳ سی پر فائق و راجح قرار دینے کا ہے۔ دونوں متضاد ہیں، یہ تو بالکل واضح ہے۔ ۲۰۹ کے تحت ایک جج کو یہ تحفظ حاصل ہے کہ اس کو اس کے عہدے سے صرف

سپریم جوڈیشل کونسل ہی ہٹا سکتی ہے، ۲۰۳ سی کے تحت حکومت، ایک ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا شریعت کورٹ میں تبادلہ کر سکتی ہے، جس سے اس کی شرائط ملازمت اتنی غیر محفوظ ہو جاتی ہیں کہ حکومت اس کو چپڑاسی بھی لگا سکتی ہے۔ یہ تضاد ترمیم کرنے والوں کا قصور ہے۔ عدالت کو تو یہ تضاد رفع کرنا ہی تھا، اور اس نے بالکل صحیح کیا کہ ۲۰۹ کو ۲۰۳ سی پر فائق کیا۔ لیکن ہم ادب سے عرض کریں گے کہ اس مقصد کے لیے اس نے جو استدلال کیا وہ بہت کمزور اور متناقض ہے، یعنی یہ کہ دفعہ ۲۰۹ بانیان دستور نے بنائی تھی، ۲۰۳ سی مارشل لا نے۔ کیا اگر ۲۰۳ سی جیسی دفعہ دو تہائی اکثریت سے پاس ہوتی تو اسے غیر موثر نہ قرار دیا جاتا۔ اگر بانیان دستور ہی نے دو دفعات ایسی رکھی ہوں جو باہم متصادم ہوں، اور ان میں سے ایک مقصد دستور کی حیثیت رکھتی ہو، تو پھر کورٹ کیا کرے گی۔ مثلاً ہماری نظر میں دفعہ ۲۴۸ اور دفعہ ۴۵ (صدر کا رحم کا اختیار) دونوں دفعہ ۲ اور ۲۔اے سے متصادم ہیں۔ (قتل کی سزا کے لیے دفعہ ۴۵ کا یہ تناقض تو لاہور ہائی کورٹ بھی تسلیم کر چکی ہے)۔

ہمارے خیال میں اس مقصد کے لیے ایک ہی مضبوط دلیل ہو سکتی تھی وہ یہ کہ چونکہ ۲۰۳ سی، عدلیہ کی آزادی کے منافی ہے، اس لیے وہ دفعہ ۲۔اے سے متصادم ہے، چنانچہ اس پر عمل درآمد نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ ۲۔الف کو اور آزادی عدلیہ کو تفوق حاصل ہے، یہ دستور کے ناقابل ترمیم حصے ہیں۔ مارشل لا ہو یا پارلیمنٹ کوئی بھی ان میں ترمیم نہیں کر سکتا، نہ دستور میں ایسی ترمیم جو ان سے تناقض ہو۔ لیکن شاید سپریم کورٹ کورٹ نے یہ استدلال اسی لیے اختیار نہیں کیا کہ وہ اس سے قبل قرارداد مقاصد کی فوقیت کے بارے میں لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو مسترد کر کے یہ قرار دے چکی تھی کہ سب دفعات برابر ہیں۔ حالیہ فیصلے کے نتیجے میں بھی اصولاً تو یہی نکلتا ہے کہ سب دفعات برابر نہیں ہیں، خواہ اس بنیاد پر کہ ایک بانیان نے ڈالی ہے اور دوسری مارشل لا نے، یا اس بنیاد پر کہ ایک ناقابل ترمیم بنیادی حصے سے متعلق ہے، دوسری اس حصے کے منافی ترمیم کر رہی ہے۔

یہ تو محترم جج ہی بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے دوسری تعبیر کیوں اختیار نہیں کی، جبکہ ایسی تعبیر بھارت کی سپریم کورٹ بھی اختیار کر چکی ہے۔ لیکن اب جب کہ ہماری سپریم کورٹ کم سے کم یہ اصول تسلیم کر چکی ہے کہ دو دفعات متصادم ہوں تو دو میں سے ایک کو فوقیت دینا جائز ہے، تو وقت آ گیا ہے کہ وہ جرات کر کے اپنے سابقہ فیصلے پر نظرثانی کرے اور قرارداد مقاصد (۲۔اے) کو دستور کا بالاترین، بنیادی، ناقابل ترمیم حصہ قرار دے، اور دستور کی جو دفعہ یا قانون اس سے متصادم ہو اس پر عمل درآمد کو غیر موثر کر دے۔ پھر ۲۔اے سے استدلال کر کے، جب اور جیسا موقع آئے، وہ اسلام کے مقام، بنیادی حقوق، جمہوری اصول اور عدلیہ کی آزادی کو بھی یہی مقام دے کہ یہ چیزیں ناقابل ترمیم ہیں۔

ایسا کیے بغیر اس ملک میں کبھی قانون کی حکومت اور عدل کا قیام عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے بغیر ان الجھنوں سے ہرگز نجات نہیں ملے گی جن میں آج پورا ملک اور عدالتیں پھنسی ہوئی ہیں۔ اسی اقدام سے ایک ترقی پذیر، پرامن، عادلانہ اور فلاحی، اسلامی معاشرے کی تعمیر ممکن ہوگی۔ اس کے بعد اگر صرف قرار دادِ مقاصد (۲-اے) اور "اسلام ریاست کا مذہب" کی بنیاد پر عدالتیں آگے بڑھیں گی، اور تدریج اور حکمت کو ملحوظ رکھیں گی، تو وہ طاقت ور حکمرانوں کی تمام بے راہ رویوں کو لگام دے سکیں گی، اور زندگی کے ہر دائرے میں لوگوں کو انصاف فراہم کر سکیں گی۔ ان کے سامنے ایسے ایسے نظائر ہوں گے کہ ان کے قانونی اثرات کا اندازہ بھی ممکن نہیں مثلاً یہ کہ حضورؐ نے ایک سرکاری اہل کار کا تمام زائد مال ضبط کر لیا تھا، حضرت عمرؓ گورنروں کے طرزِ رہایش اور مال و اسباب تک کا جائزہ لیتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو میرا کہنا نہ ماننا، حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ دجلہ و فرات کی وادی میں ایک بکری بھی بھوکی مرجائے گی تو مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا، یا یہ کہ اسلام میں کوئی آدمی عدل کے تقاضے پورے کیے بغیر جیل میں نہ ڈالا جائے گا۔

فیڈرل شریعت کورٹ کے سابق چیف جسٹس گل محمد صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی دوسرا قانون نہ ہو، اور جج اسلام کو نافذ کرنا چاہیں تو ان کے لیے یہی ایک دفعہ کافی ہے کہ "ریاست کا مذہب اسلام ہے"۔ اس کے صاف اور سیدھے معنی یہ ہیں کہ ریاست کو اسلام کی ساری ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ دیکھا جائے کہ برطانیہ میں، ۳۰ سال میں جج صاحبان نے پبلک لا کو کیا سے کیا بنا دیا ہے، تو ان کی اس بات کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

ہم ملک کے سارے بہی خواہوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس فیصلے کی حمایت میں بھی، اور آگے کے مراحل کے لیے بھی آگے آئیں اور رائے عامہ کو عدالتوں کی پشت پناہی کے لیے تیار کریں۔ رائے عامہ کی پشت پناہی کے بغیر، اس فیصلے کا باقی و برقرار رہنا بھی مشکل ہو سکتا ہے، کجا یہ کہ آگے پیش رفت ہو، اور پورے دستور ہی کو لپیٹ دینے کے منصوبے بھی دفن نہیں کر دیے گئے ہیں۔

خاص طور پر ہم دین کے علم بردار عناصر سے اپیل کریں گے کہ وہ اس مقصد کے لیے آگے آئیں۔ ہمارا احساس ہے کہ ۱۹۷۷ کے بعد سے ان عناصر نے حکمرانوں کو قانون کا پابند بنانے کے لیے کوئی آئینی و قانونی جدوجہد نہیں کی، ورنہ مارشل لا، نظریہ ضرورت، پی سی او، عدلیہ پر شب خون، غیر جماعتی انتخابات، تینوں وزرائے اعظم اور اسمبلیوں کی برخاستگی، ججوں کے شریعت کورٹ میں تبادلے --- ان سب کے خلاف سیاسی مہم میں ان کو پیش پیش ہونا چاہیے تھا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ ملک کے راہ نماؤں کو عدل و انصاف کی راہ دکھائے، عدل و انصاف پر قائم رکھے اور عدل و انصاف کے ساتھ ملک کو چلانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!